محمد سلیم الرحمٰن۔۔۔۔

زیادہ پرانی بات نہیں، بر صغیر پاک و ہند کی اسی فیصد آبادی دیہات میں رہتی تھی۔ حکم اس پر ان بیس فی صد لوگوں کا چلتا تھا جو شہروں میں بسنے کے ناتے مذہب، ثقافت اور قانون کے ٹھیکے دار بنے بیٹھے تھے۔ لیکن بیس فی صد بھی کہاں! شہر میں آباد ہونے کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ سارے شہری فائق اور برتر کہلانے کے حق دار ہو گئے تھے۔ حکم چلانے والے تو دو تین فی صد سے زیادہ نہ تھے۔ اس خطے کو سدھارنے اور سنوارنے کے کام کا آغاز دیہات سے ہونا چاہیے تھا۔ یہ ہم نے کبھی سوچا نہ کیا۔ اس کا خمیازہ اب بھگت رہے ہیں اور آیندہ بھی بھگتیں گے۔
فی زمانہ اس تناسب میں شاید فرق آ گیا ہے۔ شہروں کی آبادی تیزی سے بڑھی ہے۔ لیکن دیہی آبادی کو صرف ساٹھ فی صد ہی متصور کیا جائے تو بھی اکثریت وہی کہلائیں گے جنھیں اگر حقارت سے نہیں تو نیم دلانہ مربیانہ انداز سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ سب فریب نظر ہے۔ بر صغیر کی پرانی لوک متوں کا سراغ دیہات کے ان قصوں کہانیوں اور روایتوں ہی میں مل سکتا ہے جو ہزاروں سالوں سے سنی اور سنائی جا رہی ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ انہیں بیان کرنے والے کہیں کہیں تھوڑا بہت اضافہ کر دیتے ہیں یا کچھ باتوں کو، جن کی معنویت پر گرد جم چکی ہو، حذف کرنا قرین مصلحت ٹھیرتا ہے۔ بہر حال، کہانیوں کا جوہر اپنی آن بان قائم رکھتا ہے۔ یہ ایک متوازی اور اوائلی ادب ہے جو، کسی ادعا، رنگین بیانی یا فضیلت مآبی کے بغیر، اپنی سادگی، بے ساختگی اور دانائی کے سہارے جادو سا جگاتا رہتا ہے۔
خدا جانے سعید بھٹا کو کیسے خیال آیا کہ پنجاب کے دیہات میں جو قصہ گو باقی رہ گئے ہیں ان کی کہانیوں کو محفوظ کر لیا جائے۔ انہوں نے سوچا کہ اگر اس کام میں تاخیر ہو گئی تو یہ قصے کہانیاں ہمیشہ کے لیے ناپید ہو جائیں گی۔ قصہ گوؤں کی یہ آخری نسل چراغِ سحری ہے۔ ان کی نئی نسل نے اپنے آباؤ اجداد کا فن سیکھا ہی نہیں یا اسے کارِ فضول سمجھا تو تحفظ کی کیا صورت نظر آتی۔ ایک قصہ گوئی پر ہی کیا موقوف ہے، مشینی دور کی برکات سے اور بہت سے پرانے پیشے اور ہنر آخری دموں پر ہیں۔ آیندہ ان کی اصطلاحات سمجھنے والے بھی نہ ملیں گے۔ خیر، اگر یہ بات کسی نے سعید بھٹا کو سجھائی تو خوب سجھائی۔ اگر انہیں خود سوجھی تو اُن کی دور اندیشی کی داد دینی چاہیے۔ انہوں نے اپنی محنت سے کیا کچھ بچا لیا۔ اس سے پہلے وہ تین کتابوں یعنی کمال کہانی، نابر کہانی اور بار کہانی میں لوک کہانیاں اکٹھی کر چکے ہیں۔ سوراج کہانی اس سلسلے کی چوتھی کتاب ہے۔ شاید ان کی زنبیل میں ابھی اور کہانیاں بھی ہوں۔
کتاب میں شامل کہانیوں کا طیف خاصا وسیع ہے۔ تاریخ کے بہت پرانے زمانوں کا ذکر بھی ہے اور نسبتاً قریب کے ادوار کا بھی۔ کہانیوں کا علاقہ قندھار سے اڑیسہ تک پھیلا ہوا ہے۔ رام چندر اور اشوک کی کہانیاں بھی ہیں، اکبر اور اورنگ زیب کے قصے بھی۔ خاص بات یہ کہ کہانی کہنے والا بالعموم حال کا صیغہ استعمال کرتا ہے جیسے یہ تاثر دینا مقصود ہو کہ سب کچھ ابھی ابھی اور آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ فوریت کے تاثر سے قصہ گو نے قوی ہتھیار کا کام لیا ہے۔ پہلی کہانی رام چندر کے بارے میں ہے جس کو نیم تاریخی نیم اسطوری سمجھنا چاہیے۔ راجا کرنال کا تعلق اشوک سے جوڑا گیا ہے۔ باقی کہانیوں میں بیربل، ملاں دوپیازہ، تان سین اور سعد اللہ خان چنیوٹی جانے پہچانے کردار ہیں۔ یہ الگ بات کہ ان کہانیوں میں وہ لوک رنگ کا چولا پہنے نظر آتے ہیں۔ یہاں تاریخی حقائق کا سراغ لگانا چنداں ضروری نہیں۔ لوک حافظے میں تاریخ سنین وار موجود نہیں ہوتی بلکہ اس میں مختلف زمانے بڑی آسانی سے آپس میں گڈ مڈ ہو کر اور ہی طرح کی وحدت میں ڈھل جاتے ہیں۔ لوک کہانیوں میں تاریخ کے دھارے سیدھے بھی بہتے ہیں اور الٹے بھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک کہانی میں امیر خسرو کو اکبر کے دربار میں دکھایا جاتا ہے تو یہ کوئی ان ہونی بات معلوم نہیں ہوتی۔ اگر ثقہ مورخین اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے تاریخ کو مسخ کر سکتے ہیں اور ان کا وقار قائم رہتا ہے تو لوک کہانیوں کو بیان کرنے والے تاریخ سے کیوں نہیں کھیل سکتے؟ کم از کم ان کے سامنے کوئی خفیہ ایجنڈا تو نہیں ہوتا۔
سب سے دل چسپ کہانیاں بیربل اور ملاں دوپیازہ کے بارے میں ہیں۔ ان کے بعد رادھا بھٹیانی اور سعد اللہ چنیوٹی کو رکھا جا سکتا ہے۔ ملاں دو

پیازہ میں اکبر جو خواب دیکھتا ہے وہ خوب ہے۔ اس خواب کی تعبیر معلوم کرنے کے لیے ملاں کو اڑیسہ جانا پڑتا ہے۔ سفر کا احوال بھی دل چسپ ہے۔ آخر میں خواب کی تعبیر تخیل کی ندرت کا نمونہ ہے۔ ان کہانیوں کا خاص پہلو یہ ہے کہ عورتیں، مثبت اور دلیرانہ انداز میں، اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ان کہانیوں پر اس زن دشمنی اور زن بیزاری کا سایہ بھی نہیں پڑا جس سے مشرقی اور مغربی ادب بھرا ہوا ہے۔ یہ دانش مندی اور جرات میں کسی طرح مردوں سے پیچھے نہیں۔ رادھا بھٹیانی میں جب اکبر بادشاہ ہار مان کر تخت اور تاج احمد شاہ بھٹی کے حوالے کرنا چاہتا ہے تو رادھا بھٹیانی تڑخ کر کہتی ہے آگ لگاؤں تیرے تخت کو، تخت ہمارا گھر ہے۔ اور پھر، بقول قصہ گو، دونوں گھوڑے پر چڑھ کر وہ تو جی بھٹنیر جا بیٹھے اور ہم یہ بیٹھے ہیں۔ جیسے کہنے سننے والے سب کہانی میں پوری طرح شریک ہیں۔

ان کہانیوں میں، جیسا کہ لوک کہانیوں میں اکثر دیکھنے کو ملتا ہے، جابجا نظم کے ٹکڑے بھی آ جاتے ہیں۔ شاید انہیں ساز یا سازوں کے ساتھ ترنم سے سنایا جاتا ہو۔ بعض لفظ کہانیاں سنانے والوں نے ایسے بھی برتے ہیں جو یقین ہے کہ ان کے دادوں پر دادوں نے کبھی استعمال نہ کیے ہوں گے، مثلاً ڈاکٹر، مانیٹر، سپرنگ والی کرسی، پنسل۔ فرق کیا پڑتا ہے۔ ہر دور میں زبان نئے الفاظ کو اپنے میں جذب کرتی رہتی ہے۔ اس کے لیے وہ کبھی کسی کو جواب دہ نہیں ہوتی کہ اصل میں یہ رد و قبول اس کی خود مختاری کی دلیل ہے۔

راج کہانی از سعید بھٹا؛ ناشر، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور؛ صفحات 114، دو سو روپے۔